الیقین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں جب انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے تو اُس دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہاں کی جن جن باتوں کی خبر انسان کو یہاں دی گئی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ اُس وقت اہل ایمان کا علم الیقین، عین الیقین میں ڈھل جاتا ہے اور اُس وقت کٹر سے کٹر ملحد اور کافر بھی یقین لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس یقین کی وادی کا دروازہ موت ہے۔ (مرتب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے، انبیاء، شہداء اور صالحین گنہگاروں کی شفاعت کریں گے اور وہ ان کی شفاعت سے جہنم سے نکال لیے جائیں گے سوائے ان چار قسم کے مجرمین کے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ یعنی جو نماز اور زکوٰۃ کے تارک ہیں، جو اہل باطل کی اسلام کے خلاف باتوں میں ان کے شریک رہتے ہیں اور جو قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

ہمارے جاننے والے چند اصحاب کو یہ بات تسلیم کرنے میں تردد ہے کہ یہاں نکذب بیوم الدین سے مراد تکذیب عملی ہے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جرائم کا ذکر ہے ان سب کا تعلق عمل سے ہے، کسی ایک کا بھی تعلق قول سے نہیں ہے۔ منکر صلوٰۃ اور منکرِ زکوٰۃ مجرم نہیں بلکہ کافر ہے۔ جب کہ تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کافر نہیں ہے مجرم ہے۔ جرم یہ ہے کہ وہ زبان سے ان کا اقرار کر رہا ہے اور اپنے عمل سے ان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اسی طرح سے جو زبان سے آخرت کا اقرار کرے لیکن اس عقیدے کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ آخرت کے عقیدے کی عملی تکذیب کا مجرم ہے کافر نہیں ہے۔ ایک مسلمان جب خوض کرنے والوں کے ساتھ خوض کرتا ہے اور زندگی کے دیگر معاملات میں اللہ کی حکم عدولی کرتا ہے، اُس وقت اس کے دل سے آخرت کا خوف نکل چکا ہوا ہے، چاہے زبان سے وہ آخرت کا اقرار کرتا ہو لیکن اپنے عمل سے وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا اعترافِ جرم ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ القیامۃ (75)

آیت نمبر (1 تا 15)

ترکیب

(آیت۔3) اَلَّنۡ میں ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ اگر یہ ہمزۂ استفہام ہوتا تو اَلَنۡ آتا۔ لام پر تشدید بتا رہی ہے کہ یہ دراصل اَنۡ لَّنۡ ہے اور اَنۡ کا نون گرا ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام پر اَنۡ کے نون کو گرا کر لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے، ورنہ عام عربی میں اس کو اَنۡ لَّنۡ ہی لکھتے ہیں البتہ پڑھتے اَلَّنۡ ہیں۔ (آیت۔4) قٰدِرُوۡنَ کے بجائے قٰدِرِیۡنَ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس لیے بَلٰی کے بعد لَنَجۡمَعَنَّ محذوف مانا جاتا ہے۔ اس طرح جملہ کا اصل مفہوم ہے کہ کیوں نہیں! ہم لازماً جمع کریں گے قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ..... (آیت۔ 11) لَا وَزَرَ میں وَزَرَ ماضی کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسم وَزَرٌ ہے۔ اس پر لائے نَفۡیِ جنس داخل ہونے کی وجہ سے یہ وَزَرَ ہوا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/2)

ترجمہ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾	وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی	اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں بار بار ملامت کرنے والے نفس کی

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾	بَلٰی	قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ
کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم ہرگز جمع نہیں کریں گے اس کی ہڈیوں کو	کیوں نہیں (ہم ضرور جمع کریں گے)	قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ

نُسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾	بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ	لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾
ہم درست کر دیں اس کی پور پور کو	بلکہ چاہتا ہے انسان	کہ وہ اپنی مرضی چلائے اپنے آگے (آنے والے وقت میں بھی)

6940

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾	فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾	وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾	وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾
وہ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن	تو جب چندھیا جائے گی آنکھ	اور گہنا جائے گا چاند	اور اکٹھا کیے جائیں گے سورج اور چاند

يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ	اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾	كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾
کہے گا انسان اس دن	کدھر ہے بھاگنے کی جگہ	ہرگز نہیں! کوئی بھی پناہ گاہ نہیں ہے

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾	يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ	بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾
تیرے رب کی طرف ہی اس دن ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے	جتلا دیا جائے گا انسان کو اس دن	وہ جو اس نے آگے بھیجا اور (جو) اس نے پیچھے چھوڑا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾	وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾
بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے	اور اگرچہ وہ ڈالے (پیش کرے) اپنے بہانے

نوٹ: 1

یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس (ضمیر) کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا گیا کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی یہ امر یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس نظام کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا اور لازماً اس کی ایک انتہا ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت کی ہی قسم کھائی ہے لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفس لوامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس کا ضمیر اسے برائی کرنے اور بھلائی نہ کرنے پر ٹوکتا ضرور ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے اور وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اب اگر انسان میں نفس لوامہ کی موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یہی نفس لوامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضہ کہ انسان کو اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

نفس لوامہ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفس انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرما دیا ہے۔ اور اس کے لیے ضابطہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا ہے اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔ سورۃ الشمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ''اور گواہ ہے نفس اور اس کی تشکیل۔ پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا وہ نامراد ہوا۔'' (آیات۔ 7۔10)۔ اس تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (سورہ یوسف۔53) لیکن یہ نفس

نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے۔اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے آپ کو بھی برائی صادر ہونے پر ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفس امارہ 6940 سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توزان کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء وسزا کو یاد رکھے۔یہ یادِ نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اپنی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل اس کے آگے سپر انداز ہو جائے۔اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفس لوامہ فوراً اس کو ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ وانابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔سورۃ الفجر۔27۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔3۔4۔کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں اس پر تعجب ہے کہ میّت کے ذرات منتشرہ اور بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کیسے کیا جائے گا۔حالانکہ یہ بات ایک مرتبہ مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ہر انسان کا وجود جو دنیا میں پلتا اور بڑھتا ہے وہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور خطوں کے اجزاء اور ذرات کا مرکب ہوتا ہے۔تو جس ذاتِ قادر نے پہلی مرتبہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ذرات کو ایک انسان کے وجود میں جمع کر دیا تھا، اس کے لیے دوبارہ جمع کرنا کیوں مشکل ہوگا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم صرف اسی پر قادر نہیں ہیں کہ مَیّت کے سارے اجزاء واعضاء کو دوبارہ اسی طرح بنا دیں بلکہ انسانی وجود کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی ہم ٹھیک اسی طرح کر دیں گے جس طرح وہ پہلے تھی۔اس میں بنان یعنی انگلیوں کے پوروں کا خاص ذکر فرمایا کہ وہ سب سے چھوٹے اجزاء ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو شاید انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو حق تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لیے اس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔خصوصاً انسانی چہرہ جو چند انچ مربع سے زائد نہیں، اس کے اندر قدرت حق نے ایسے امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے کے ساتھ اتنا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔انسان کی زبان اور حلقوم ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسی ممتاز ہے کہ بچے، بوڑھے، عورت، مرد کی آوازیں الگ پہچانی جاتی ہیں۔اور ہر انسان کی آواز الگ الگ پہچانی جاتی ہے۔اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز انسان کے انگوٹھے اور انگلیوں کے پور ہیں کہ ان کے اوپر جو نقش ونگار خطوط کے جال کی صورت میں قدرت نے بنائے ہیں وہ بھی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے۔صرف آدھا انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ پور مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط دوسرے سے نہیں ملتے۔قدیم وجدید ہر زمانے میں انگوٹھے کے نشان کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر اس پر عدالتی فیصلے ہوتے رہے ہیں، اور اب فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی کے پور کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد بنان کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں تو اسی پر تعجب ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوگا۔ذرا اس سے آگے سوچو اور غور کرو کہ وہ صرف زندہ ہی نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ شکل وصورت اور اس کے ہر امتیازی وصف کے ساتھ زندہ ہوگا۔یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے، دوبارہ بھی بالکل وہی ہوں گے۔(معارف القرآن)

نوٹ:4 آیات۔7۔9۔ میں قیامت کے پہلے مرحلے میں نظام عالم کے درہم برہم ہوجانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند گہنے سے مراد چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہو گی جو سورج سے ماخوذ ہے، بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین یکا یک الٹی چل پڑے اور اس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند زمین کی کشش سے چھوٹ کر نکل جائے اور سورج میں جا پڑے۔ ممکن ہے اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5 آیت۔13۔ میں ہے بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کو اس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی۔ اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا برے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اس کے بعد مدت ہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر اس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اس سے بھی اسے آگاہ کیا جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کر لیا وہ آگے بھیج دیا۔ اور جو نیک یا بد، مفید یا مضر کوئی طریقہ، کوئی رسم ایسی چھوڑی کہ اس کے بعد لوگ اس پر عمل کریں، وہ اس نے پیچھے چھوڑا۔ اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مَا قَدَّمَ سے مراد وہ عمل صالح جو اپنی زندگی میں کر گزرا اور مَا اَخَّرَ سے مراد وہ عمل صالح ہے جس کو کر سکتا تھا مگر نہ کیا اور فرصت ضائع کر دی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (16 تا 30)

ح ر ك

(ك)	حَرَكًا	ہلنا۔ حرکت کرنا۔
(تفعیل)	تَحْرِيْكًا	ہلانا۔ حرکت دینا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ن ض ر

(ن۔س)	نَضْرَةً	تروتازہ ہونا۔ ملائم ہونا۔ خوبصورت ہونے والا۔
	نَضْرَةٌ	اسم ذات بھی ہے۔ تروتازگی۔ ملائمیت، خوبصورتی۔ ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴾ (83/المطففین:32) ''تو پہچانے گا ان کے چہروں میں ہمیشگی کی تروتازگی کو۔''
	نَاضِرَةٌ	اسم الفاعل ہے۔ تروتازہ ہونے والی۔ زیر مطالعہ آیت۔32۔

ترجمہ

6940

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ	لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶
آپؐ حرکت نہ دیں اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو	تاکہ آپؐ جلدی یاد کریں اس کو

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ	وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷	فَاِذَا قَرَاْنٰهُ	فَاتَّبِعْ
بیشک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا۔ (آپؐ کے سینے میں)	اور (آسان کرنا) اس کا پڑھنا	پھر جب بھی ہم (فرشتے کی زبان سے) پڑھیں اس کو	تو آپؐ پیچھے پیچھے چلیں

قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹	كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ ۝۲۰
اس کو پڑھے جانے کے	پھر بیشک ہم پر ہے اس کا ظاہر کرنا	ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ پسند کرتے ہو	جلدی حاصل ہونے والی (دنیا) کو

وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱	وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲	اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳
اور تم لوگ چھوڑتے ہو پیچھے ہونے والی (آخرت) کو	کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہیں

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝۲۴	تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ	بِهَا فَاقِرَةٌ ۝۲۵
اور کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں	وہ گمان کریں گے کہ کیا جائے گا	ان کے ساتھ (کمر) توڑنے والا کام

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝۲۶	وَقِيْلَ مَنْ ۜ سکتۃ	رَاقٍ ۝۲۷
ہرگز نہیں جب کبھی پہنچتی ہے (جان) ہنسلیوں تک	اور کہا جاتا ہے کون (کوئی)	جھاڑ پھونک کرنے والا ہے

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝۲۸	وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝۲۹	اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ اِۨلْمَسَاقُ ۝۳۰ ع
اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے	اور (جب) لپٹی ہے پنڈلی پنڈلی سے	(تو وہ سمجھتا ہے) تیرے رب کی طرف اُس دن ہانکا جانا ہے

نوٹ:1

آیت۔16۔ سے لے کر۔19۔ تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلہ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جبکہ آپؐ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ آپ! کو وہ کلام ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں۔ اس لیے آپؐ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت جبریلؑ سورۂ قیامہ کی آیات آپؐ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام کو توڑ کر آپ! کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں۔ اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ یہ فرمانے کے بعد اصل سلسلۂ کلام ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے'' سے پھر شروع ہو جاتا ہے جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک استاد درس دیتے ہوئے یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ روک کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے آگے پھر اپنا درس شروع کر دے۔

ان آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر طبرانی، بیہقی وغیرہ میں معتبر روایات سے اس کی یہی وجہ بیان ہوئی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔17۔ میں لفظ جمع ایک جامع لفظ ہے۔اس سے مراد قرآن کو نبی ﷺ کے سینے میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی 6940 میں پرونا بھی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپؐ جمع کرائیں۔ چنانچہ اسی رہنمائی کی روشنی میں آپؐ نے الگ الگ سورتوں میں ان کے مواقع کے تعین کے ساتھ آیات جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی۔اس کے علاوہ ایک مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی ﷺ حضرت جبریلؑ کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تا کہ کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپؐ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔19۔ بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں آدمی اگر اچھی طرح سمجھ لے تو وہ ان گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔اولاً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی جو تفہیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظ قرآن کے علاوہ تھی۔ یہ وحی خفی (وحی غیر متلو) کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔(قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات 94۔95۔اور صفحات 118 تا 125 میں پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً قرآن کے احکام کی تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تھی وہ اسی لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور قرآن کے احکام پر (اللہ کی مرضی کے مطابق۔مرتب) عمل کرنا سکھائیں۔اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریح علم کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل کی آیت۔44۔میں فرمایا ہے: ''اور اے نبیؐ یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔'' اور قرآن میں چار جگہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہیں تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔(ان سب آیات کی تشریح ہم ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحہ 74 تا 77 میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی مستند اور سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ قرآن نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی جاننے والا محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہی اس پر کیسے عمل کیا جائے۔مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہے۔محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک تعین نہیں کر سکتا۔قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد کوئی خاص فعل ہے لیکن قرآن پڑھ کر کوئی عربی جاننے والا یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک معلم کو مقرر کر کے صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے سکھا دیا جس کی وجہ سے آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا۔

رابعًا قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول و عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رائج ہوا۔ اس ذریعہ علم کو جو شخص قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت۔19۔ میں قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ لی تھی، تو ان کا یہ قول خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ جعل ساز لوگ وہی سکے جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون جعلی طور پر چھاپے گا۔ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اس امت کے خیر خواہ لوگوں نے اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا تھا کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا ہی عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر حدیث سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص۱۶۹ تا ۱۷۱ سے ماخوذ)

نوٹ: 4 اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی انسانی صلاحیت کے متعلق بات ہو چکی ہے۔ آیت نمبر 6/ الانعام: 103، نوٹ۔ 1 ﷺ دوبارہ دیکھ لیں۔

آیت نمبر (31 تا 40)

م	ط	ی

(س) مَطِيًّا لمبا ہونا۔ دراز ہونا۔

(تفعل) تَمَطَّيَا بتکلف دراز ہونا۔ اکڑ کر چلنا۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ترجمہ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾	وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾
پھر اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی	اور لیکن (بلکہ) اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾	اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾
پھر وہ گیا اپنے گھر والوں کی طرف	اکڑتا ہوا	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب

ثُمَّ	اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى ﴿۳۵﴾	اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ ﴿۳۶﴾
پھر (I Repeat)	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب	کیا سمجھتا ہے انسان

اَنۡ يُّتۡرَكَ	سُدًى ﴿۳۶﴾	اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً	مِّنۡ مَّنِىٍّ	يُّمۡنٰى ﴿۳۷﴾
کہ وہ چھوڑ دیا جائے گا	(یوں ہی) بے لگام	کیا وہ نہیں تھا ایک ایسی بوند	کسی منی میں سے جو	ٹپکائی گئی

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً	فَخَلَقَ	فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾	فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ
پھر وہ تھا خون کا ایک لوتھڑا	تو اس نے بنایا (اس کو)	پھر اس نے (ناک نقشہ) درست کیا	پھر اس نے بنائے اس سے جوڑے

الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى ﴿۳۹﴾	اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ	عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡىِۦَ الۡمَوۡتٰى ﴿۴۰﴾
مذکر اور مؤنث کے	کیا وہ قدرت رکھنے والا نہیں ہے	اس پر کہ وہ زندہ کرے مُردوں کو

نوٹ: 1

آیات۔31 تا33۔کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سنا جو اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار پر ہی اڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا ہے اس میں یہ الفاظ کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کر لینے کا اولین اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھے۔اللہ کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آجاتا ہے۔اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ کس حد تک اس کے دل کی آواز ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یوں ہی چھوٹا پھر رہا ہو، جہاں چاہے چرتا پھرے اور کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔اس معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو۔کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو۔اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے، یہی بات سورۂ المومنون کی آیت۔115۔میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے۔''

ان دونوں مقامات پر موت کے بعد کی زندگی کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے۔کیا تمہیں اپنے میں اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم با اختیار ہو۔اس کے افعال میں اخلاقی حسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے۔پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے اسی طرح تم بھی ہو۔جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی حاجت ہو۔لیکن تم حیات بعد موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ مرتے دم تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مستوجب ہونے کا خود تمہاری عقل حکم لگاتی ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی آخری آیت کی تلاوت کرے، اس کو یہ کلمات کہنے چاہیے، بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ یعنی بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلٰت کی آخری آیت پر پہنچے تو اس کو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ(76)

آیت نمبر(1تا10)

م	ش	ج

(ن) مَشْجًا خلط ملط کرنا۔ ملانا۔
مَشِيْجٌ ج اَمْشَاجٌ مخلوط۔ ملا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

م	ز	ج

(ن) مَزْجًا پینے کی چیز میں کچھ ملانا جیسے شراب میں پانی ملانا۔
مِزَاجٌ جو چیز ملائی جائے۔ ملاوٹ۔ آمیزش۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

ترجمہ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ	حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ	لَمْ يَكُنْ	شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①
کیا پہنچا (گزرا) انسان پر	کوئی ایسا وقت زمانے میں سے	جب وہ تھا ہی نہیں	کوئی ذکر کی جانے والی چیز

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	مِنْ نُّطْفَةٍ	اَمْشَاجٍ ۖ	نَّبْتَلِيْهِ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	ایک ایسی بوند سے جو	ملی جلی چیزوں سے تھی	ہم (رحم مادر میں) الٹتے پلٹتے رہے اس (انسان) کو

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②	اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ	اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③
پھر ہم نے بنایا اس کو سننے والا دیکھنے والا	بیشک ہم نے سجھا دیا اس کو یہ راستہ	(اب) چاہے شکر کرنے والا ہو اور چاہے ناشکری کرنے والا ہو

اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ	سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④	اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ
بیشک ہم نے تیار کیا کافروں کے لیے	زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ	بیشک نیک لوگ پئیں گے

مِنْ كَاْسٍ	كَانَ مِزَاجُهَا	كَافُوْرًا ۚ ⑤	عَيْنًا	يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ
ایک ایسے جام سے	جس کی آمیزش	کافور ہے	جو ایک چشمہ ہے	پئیں گے جس سے اللہ کے بندے

يُفَجِّرُوْنَهَا	تَفْجِيْرًا ⑥	يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ	وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا
وہ لوگ جاری کریں گے اس کو	جیسے جاری کرنے کا حق ہے	وہ لوگ (اس دنیا میں) پوری کرتے ہیں منت	اور ڈرتے ہیں ایک ایسے دن سے

كَانَ شَرُّهٗ	مُسْتَطِيْرًا ۝۷	وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ	عَلٰى حُبِّهٖ 6940
جس کا شر	پھیل جانے والا ہے	اور وہ لوگ کھلاتے ہیں کھانا	اس (کھانے) کی محبت کے باوجود

مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸	اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	لِوَجْهِ اللّٰهِ
مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو	(کہتے ہیں) ہم تو بس کھلاتے ہیں تم کو	اللہ کی توجہ (حاصل کرنے) کے لیے

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ	جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹	اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا
ہم نہیں چاہتے تم سے	کوئی بدلہ اور نہ کوئی احسان ماننا	بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے

يَوْمًا	عَبُوْسًا	قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰
ایک ایسے دن سے جو	بہت ترش ہوگا	بہت شدید ہوگا

نوٹ: 1

اکثر مفسرین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بیشک انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں ''کیا'' کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معانی میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا یہ واقعہ ہوا ہے؟ کبھی ہمارا مقصود سوال نہیں بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار ہم اس انداز میں کرتے ہیں کہ کیا یہ کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے۔ (یعنی نہیں کرسکتا)۔ کبھی ہم کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہاری رقم ادا کردی۔ اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض سے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کردیں جو لازماً اقرار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقعہ اس پر ایک ایسا وقت گزرا ہے، بلکہ یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کرکے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے سے آخر کیوں عاجز ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ میں لفظ اَمْشَاجٍ جمع ہے مَشِيْجٌ کی (جبکہ نُّطْفَةٍ واحد ہے) اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ اَمْشَاجٍ اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوجود مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آئے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

اِمْشَاجٌ کے معنی مخلوط کے آتے ہیں اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد و زن کا مخلوط نطفہ مراد ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے فرمایا ہے۔ اور روح المعانی میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ امشاج سے مراد اخلاطِ اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفراء ہیں جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاطِ اربعہ بھی اقسام غذا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اس میں دور دراز ملکوں اور خطوں کی آب و ہوا کے اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کے موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے جو دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قدرت کے نظامِ عجیب نے حیرت انگیز طریقہ پر

ان کو اس کے وجود میں سمویا۔ ہے۔ اگر امشاج کا یہ مطلب لیا جائے تو اس جگہ لفظ امشاج کے ذکر سے منکرین قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے میں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دنیا میں بکھر جاتا ہے، ان کو دوبارہ جمع کرنا پھر ان میں روح ڈالنا ان کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔ امشاج کی اس تفسیر میں ان کے اس شبہ کا واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیق انسان میں بھی تو دنیا بھر کے اجزاء و ذرات شامل تھے۔ جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اس کے لیے اس کا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو گیا۔ اس طرح اس جگہ لفظ امشاج کا اضافہ ایک مستقل فائدہ کے لیے ہو سکتا ہے۔ (معارف القرآن)۔ کیونکہ لفظ امشاج کے بغیر صرف لفظ نطفہ سے بھی بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے باجود اگر اس پر لفظ امشاج کا اضافہ کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ زیب داستان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی مقصد ہے۔ (مرتب)

نَبْتَلِيْهِ کو عام طور پر لوگوں نے بیان علت کے مفہوم میں لیا ہے، یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ اگر علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لامِ علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح (یعنی اس حال میں۔ مرتب) پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔ ابتلاء کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ حج کی آیت۔ 5۔ میں ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک نطفہ سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تمام اور کوئی ناتمام۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون کی ایات۔ 12 تا 14۔ میں یوں آئی ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا ایک نطفہ کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل دوسری ہی مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف آیت زیر بحث میں اجمال کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ نَبْتَلِيْهِ آیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہو گئی یا نہیں۔ پھر وہ دور آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمع و بصر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ یہاں پر سَمِيْعًا بَصِيْرًا انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا بن جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی نکلنا لازمی ہے ورنہ اس سارے اہتمام کا کیا مقصد جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو نذر (منت) کہتے ہیں۔ وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں ایفائے نذر کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا 6940 ہے۔ جو لوگ ایسی نذروں کو پورا کرنے کا بھی اہتمام کریں جو انہوں نے بطور خود اپنے اوپر واجب کی ہوں، ان سے ایسی نیکیوں کے اہتمام کی توقع بدرجۂ اولیٰ ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نذر کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ عربوں کے اندر اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس لیے ان کے نیک لوگ نذروں کے ذریعے سے اس خلا کو بھرتے تھے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں، وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلف مالا یطاق نوعیت کی تھیں، وہ بھی یا تو ممنوع قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا ہے۔ بعد میں جب شریعت کا پورا میثاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا۔ (تدبر قرآن)۔

فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ ان دونوں قسم کی نذروں پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مباح کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کر لے یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے یا کفارہ ادا کر دے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) فَوَقٰهُمْ اور لَقّٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیریں آیت۔5۔ میں مذکور اَلْاَبْرَارَ کے لیے ہے جبکہ ذٰلِكَ الْيَوْمِ میں اشارہ گزشتہ آیت میں مذکور يَوْمًا عَبُوْسًا کے لیے ہے۔ (آیت۔14) دَانِيَةً حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ یہاں پر اس نے فعل کا عمل کیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:54، نوٹ۔1) ظِلٰلُهَا اس کا فاعل ہے۔ ذُلِّلَتْ کا نائب فاعل قُطُوْفُهَا ہے۔ قُطُوْفٌ جمع مکسر ہے اس لیے فعل ذُلِّلَتْ واحد مؤنث آیا ہے۔ (آیت۔15) بِاٰنِيَةٍ کے حرفِ جر ب پر عطف ہونے کی وجہ سے اَكْوَابٍ حالت جر میں آیا ہے۔ اٰنِيَةٍ اور اَكْوَابٍ کو يُطَافُ کا نائب فاعل مان کر بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن حافظ احمد یار صاحب کی رائے ہے کہ يُطَافُ کا نائب فاعل اس میں شامل ضمیر ہے جو خُدّام کے لیے ہے۔ ترجمہ شیخ الہند کے ترجمہ میں بھی اسی لحاظ سے ترجمہ ہے۔ ہم اسی کو ترجیح دیں گے۔ قَوَارِيْرُ آتا ہے۔ یہاں الف کے اضافے کے ساتھ لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے۔ (آیت۔21) عٰلِيَهُمْ میں اسم الفاعل عَالٍ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں عَالِيًا ہے مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ضم ہوئی تو عَالِيَ استعمال ہوا۔ یہ بھی یہاں فعل کا عمل کر رہا ہے۔ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اس کا فاعل ہے۔ خُضْرٌ اِسْتَبْرَقٌ صفت نہیں ہیں۔ اگر یہ ثِيَابُ کی صفت ہوتے تو اَلْخُضْرُ اور اَلْاِسْتَبْرَقُ آتے۔ کیونکہ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اضافت کی وجہ سے معرفہ ہے جب موصوف معرفہ ہو تو صفت بھی معرفہ ہی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر ہیں اور ان کا مبتدا هِيَ محذوف ہے جو ثِيَابُ کے لیے ہے۔ (آیت۔22) اِنَّ کا اسم هٰذَا ہے اور محلاً حالت نصب میں

ہے۔اس کے آگے پورا جملہ کَانَ لَکُمۡ جَزَآءً۔ اِنَّ کی خبر ہے اور محلاً حالتِ رفع میں ہے۔اس جملے میں کَانَ کا اسم اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر
1940
ہے اور اس کی خبر ہونے کی وجہ سے جزاءً حالتِ نصب میں ہے۔اگلے جملے میں کَانَ کا اسم سَعۡیُکُمۡ ہے اور مَّشۡکُوۡرًا اس کی خبر ہے۔ان
آیات میں قیامت کے حالات کا ذکر ہے۔اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27،نوٹ۔3)

ترجمہ

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ	شَرَّ ذٰلِكَ الۡيَوۡمِ	وَلَقّٰىهُمۡ نَضۡرَةً وَّسُرُوۡرًا (11)
تو بچایا ان کو اللہ نے	اس دن کے شر سے	اور دی ان کو تازی اور سرور

وَجَزٰىهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا	جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا (12)	مُّتَّكِـئِيۡنَ فِيۡهَا
اور اس نے بدلے میں دیا ان کو بسبب اس کے جو وہ ثابت قدم رہے	ایک باغ اور باریک ریشم	ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوتے ہوئے اس میں

عَلَى الۡاَرَآئِكِ	لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا	شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِيۡرًا (13)
آراستہ تختوں پر	وہ لوگ نہیں دیکھیں گے اس میں	کوئی سورج (دھوپ) اور نہ کوئی ٹھٹھرن

وَدَانِيَةً عَلَيۡهِمۡ	ظِلٰلُهَا	وَذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا
اور نزدیک ہونے (جھکنے) والے ہوتے ہوئے ان پر	اس کے سائے	اور مطیع کیے (جھکائے) گئے اس کے پھل

تَذۡلِيۡلًا (14)	وَيُطَافُ عَلَيۡهِمۡ	بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ
جیسی جھکائے جانے کا حق ہے	اور گھمائے پھرائے جائیں گے ان کے گرد (خدام)	ایسے برتنوں کے ساتھ جو چاندی کے ہوں گے

وَّاَكۡوَابٍ	كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا۠ (15)	قَوَارِيۡرَا۠ مِنۡ فِضَّةٍ
اور ایسے آبخوروں کے ساتھ جو	ہوں گے شیشے کے	(وہ) شیشے چاندی کے ہوں گے

قَدَّرُوۡهَا	تَقۡدِيۡرًا (16)	وَيُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا	كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا
(خدام) اندازہ مقرر کریں گے جن کا	جیسے اندازہ کرنے کا حق ہے	وہ (ابرار) لوگ پلائے جائیں گے اس میں	ایک ایسے پیالے سے جس کی ملاوٹ

زَنۡجَبِيۡلًا (17)	عَيۡنًا فِيۡهَا	تُسَمّٰى	سَلۡسَبِيۡلًا (18)	وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ
ادرک ہے	جو ایک چشمہ ہے اس میں	اس کو نام دیا جائے گا	سلسبیل	اور گھومیں پھریں گے ان کے گرد

وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ	اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ	حَسِبۡتَهُمۡ	لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا (19)
ہمیشگی دیئے ہوئے کم عمر لڑکے	جب بھی تو دیکھے گا ان کو	تو تو گمان کرے گا ان کو	بکھیرے ہوئے موتی

وَاِذَا رَاَيۡتَ	ثَمَّ رَاَيۡتَ	نَعِيۡمًا	وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا (20)
اور جب بھی تو دیکھے گا	تو وہیں تو دیکھے گا	دائمی خوشحالی	اور ایک بڑی بادشاہت

عٰلِيَهُمْ	ثِيَابُ سُنْدُسٍ	خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۡ	وَّحُلُّوْٓا
چڑھنے والے ہوتے ہوئے ان پر	کچھ باریک ریشم کے کپڑے ہوں گے	(وہ) سبز اور بھڑکیلے ہوں گے	اور ان کو آراستہ کیا جائے گا

اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ	وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ	شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾
چاندی کے کنگنوں سے	اور پلائے گا ان کو ان کا رب	ایک نہایت پاکیزہ مشروب

اِنَّ هٰذَا	كَانَ لَكُمْ جَزَآءً	وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ	مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ ع
بیشک یہ	ہوگا تمہارے لیے ایک بدلہ	اور ہوگی تمہاری دوڑ دھوپ	قدر کی ہوئی

نوٹ:1

آیت۔13۔ میں سورج اور زمہریر نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے محفوظ رہیں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت اور تمازت نہ ہوگی۔ وہاں کا موسم معتدل اور پُر بہار رہے گا۔ خزاں کی نحوست اور بادِ زمہریر (یخ ٹھنڈی ہوا) سے ان کو کبھی سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ (تدبر قرآن)۔

اگلی آیت میں شاید درختوں کی شاخوں کو ظلال (سائے) سے تعبیر فرمایا ہے یا واقعی سایہ ہو۔ کیونکہ آفتاب کی دھوپ نہ سہی کوئی دوسری قسم کا نور ہوگا۔ اس کے سایہ میں بہشتی تفنن و تفریح کی غرض سے کبھی بیٹھنا چاہیں گے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

آیت۔16۔ میں چاندی کے شیشے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ چاندی کی یہ قسم اس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف جنت کی خصوصیت ہوگی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہل جنت کے دستر خوان پر ہوں گے۔

اور قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیئے جائیں گے۔ نہ وہ اس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ دوسرے الفاظ میں اہل جنت کے خدام اس قدر ہوشیار اور تمیز دار ہوں کہ وہ جس کی خدمت میں جام پیش کریں گے اس کے متعلق ان کو پورا اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی شراب پینا چاہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔21۔ میں ہے وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اس میں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ پہلے آیت۔5 میں ہے يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ (وہ لوگ پئیں گے ایک ایسے جام سے) اس کے بعد آیت۔17۔ میں فرمایا يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا (ان لوگوں کو پینے کے لیے دیا جائے گا اس میں ایک ایسے جام سے) اور یہاں ارشاد ہوا کہ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ (پلائے گا ان کو ان کا رب)۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں یعنی يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ، يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا اور سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں ہے۔ (تدبر قرآن) (فرق یہ ہے کہ شَرِبَ۔ يَشْرَبُ میں مفہوم یہ ہے کہ سامنے کسی چیز میں پینے کی کوئی چیز دیکھی یا کسی نہر یا دریا پر گزر ہوا تو ہاتھ بڑھا کر خود پی لیا۔ جبکہ باب افعال میں اَسْقٰی۔ يُسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پینے کی کوئی چیز دینا۔ يُسْقَوْنَ اس کا مضارع مجہول ہے۔ اس میں مفہوم یہ ہے کہ پینے کی چیز ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ اور ثلاثی مجرد میں سَقٰی۔ يَسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پلانا، اس طرح سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں مفہوم یہ ہے کہ ان کا رب خود ان کو پلائے گا۔ مرتب)

سوال یہ ہے کہ فرق کیوں ہے۔ شاید یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ یہ ابرار درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود ربِ کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا۔ یہ شراب طہور کیا ہے، اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہی

وجہ ہے کہ اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمہ کافور اور چشمۂ زنجبیل کے لیے 6940 اختیار فرمایا۔ اس کو صرف رب کریم ہی جانتا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (23 تا 31)

ترجمہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ	الْقُرْاٰنَ	تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾	فَاصْبِرْ
بیشک ہم نے ہی اتارا آپؐ پر	اس قرآن کو	جیسے جستہ جستہ اتارنے کا حق ہے	پس آپؐ ثابت قدم رہیں

لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ	اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾	وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
اپنے رب کے حکم کے لیے (حقیقی حکم پر)	اور کہنا مت مانیں ان میں سے	کسی گنہگار کا یا کسی ناشکرے کا	اور آپؐ یاد کریں اپنے رب کے نام کو

بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۲۵﴾	وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ	وَسَبِّحْهُ	لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾
صبح سویرے اور شام کے وقت	اور رات میں سے پھر آپ سجدہ کریں اس کو	اور آپ تسبیح کریں اس کی	طویل رات میں

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ	وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ	يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾
بیشک یہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں	جلد حاصل ہونے والی (دنیا) کو	اور وہ چھوڑتے ہیں اپنے (پیٹھ) پیچھے	ایک بھاری دن (قیامت کی فکر) کو

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ	وَشَدَدْنَآ	اَسْرَهُمْ ۚ	وَاِذَا شِئْنَا	بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ
ہم نے ہی پیدا کیا ان کو	اور ہم نے مضبوط کیا	ان کی بندش (جوڑ بند) کو	اور جب بھی ہم چاہیں گے	ہم تبدیل کر دیں گے (ان کو) ان کے جیسوں سے

تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ	فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾
جیسے تبدیل کرتے ہیں	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	تو جو چاہے	وہ بنالے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

وَمَا تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ اَنْ	يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾
اور تم لوگ کیا چاہو گے	سوائے اس کے کہ جو	چاہے گا اللہ	بیشک اللہ ہے	جاننے والا حکمت والا

يُّدْخِلُ	مَنْ يَّشَآءُ	فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ
وہ داخل کرتا ہے	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اپنی رحمت میں

وَالظّٰلِمِيْنَ	اَعَدَّ لَهُمْ	عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾
اور ظلم (شرک) کرنے والوں کو	اس نے تیار کیا ان کے لیے	ایک دردناک عذاب

نوٹ: 1 آیت۔23 میں مخاطب بظاہر نبی ﷺ ہیں لیکن دراصل روئے سخن کفار کی طرف ہے کفار مکہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآن میں بعض مقامات پر ان کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہی ہیں یعنی محمد ﷺ اس کے مصنف نہیں ہیں۔ اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں۔ یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کریں، بلکہ اسے تھوڑا

تھوڑا کر کے بھیجیں۔ (تفہیم القرآن)۔

1940

نوٹ:2

آیت۔ 28 میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ پر نظر ڈالے کہ بتقاضائے حکمت وراحت انسانی جوڑ دیکھنے میں نرم ونازک معلوم ہوتے ہیں اور نرم نرم پٹھوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جس کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ سال دوسال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے، خصوصاً جبکہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں اور موڑے تورے جاتے ہیں۔ اتنی شبانہ روز حرکت کے ساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دوسال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان نرم ونازک پٹھوں کو دیکھو کس طرح اعضاء کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں، نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں۔ انسان اپنی انگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں، کیسے کیسے زور آور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھس گیا ہوتا مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اسی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔ 29۔ 30۔ میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم وعلیم ہے۔ ان تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادیٔ اختیار اور اللہ کی مشیت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلہ میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ صرف اس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اس کے سامنے آتے ہیں ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اس کے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام ہیں۔ ان میں کسی ایک راستے کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ اس کو پوری آزادی ہے کہ وہ اچھے بُرے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کر لے۔ ایسا ہی معاملہ دین و مذہب کا ہے کہ اس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکارِ خدا، شرک و بت پرستی، شرک و توحید کے مختلف مخلوطے، ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ یہ فیصلہ بھی انسان پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اس کو حرام خور بنائے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور اللہ جبراً اسے ملحد یا مشرک یا کافر بنا دے۔

لیکن اس آزادیٔ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیت اور اس کے اذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے، تب ہی وہ اس کو کر سکتا ہے ورنہ وہ چاہے کتنی بھی کوشش کر لے اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی بات دوسری بات میں فرمائی گئی ہے۔ اس معاملہ کو یوں سمجھئے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات دے دیئے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر گزرے تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا۔ ایک قاتل دنیا کے تمام انسانوں کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا ایک جیب کترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا اگر ان میں سے ہر ایک کو من مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی اختیار میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط جس راستے پر بھی جانا چاہے اس پر اسے چلنے دے۔

اس کے بعد تیسری بات اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیت اَلل ٹپ (Arbitrary) نہیں ہے۔ وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اپنے پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا توفیق دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو اس کے لیے سازگار بناتا ہے اسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا ہو۔ ہدایت کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنا پر جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے (تفہیم القرآن۔ ج 6 ص 576۔577)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ المرسلٰت (77)

آیت نمبر (1 تا 28)

ک ف ت

(ض) کَفۡتًا کسی چیز کو جمع کر کے اپنے قبضہ میں لے لینا۔ سمیٹنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 25۔

ش م خ

(ف) شَمۡخًا بلند ہونا۔

شَامِخٰتٌ اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ بلند ہونے والی یعنی بلند۔ زیر مطالعہ آیت۔ 27۔

ترجمہ

وَالۡمُرۡسَلٰتِ	عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾	فَالۡعٰصِفٰتِ	عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے بھیجی جانے والیوں (ہواؤں) کی	بھلائی ہوتے ہوئے	پھر قسم ہے جھونکا دینے والیوں کی	جیسے جھونکا دیتے ہیں

وَّالنّٰشِرٰتِ	نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾	فَالۡفٰرِقٰتِ	فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾	فَالۡمُلۡقِیٰتِ
اور قسم ہے پھیلانے والیوں کی	جیسے پھیلاتے ہیں	پھر قسم ہے الگ الگ کرنے والیوں کی	جیسے الگ الگ کرتے ہیں	پھر قسم ہے سامنے کرنے والیوں کی

ذِکۡرًا ۙ﴿۵﴾	عُذۡرًا اَوۡ	نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾	اِنَّمَا	تُوۡعَدُوۡنَ
یاددہانی کو	عذر ختم کرنے کے لیے	یا خبردار کرنے کے لیے	کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	جو تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے

لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾	فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۙ﴿۸﴾	وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۙ﴿۹﴾
یقیناً واقع ہونے والا ہے	پھر جب ستارے مٹا دیئے جائیں گے	اور جب آسمان میں شگاف ڈالے جائیں گے

وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۙ﴿۱۰﴾	وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ ؕ﴿۱۱﴾	لِاَیِّ یَوۡمٍ اُجِّلَتۡ ؕ﴿۱۲﴾
اور جب پہاڑوں کو اکھاڑ کر اڑا دیا جائے گا	اور جب تمام رسول اکٹھا کیے جائیں گے	کس دن کے لیے مدت مقرر کی گئی

لِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ ﴿ۚ۱۳﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ ؕ﴿۱۴﴾	وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۵﴾
فیصلہ کرنے کے دن کے لیے	اور تو کیا جانے کیا ہے فیصلہ کرنے کا دن	تباہی ہے جس دن جھٹلانے والوں کے لیے

اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۶﴾	ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ	الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾	كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۸﴾
کیا ہم نے ہلاک نہیں کیا پہلوں کو	پھر ہم ان کے پیچھے بھیجتے ہیں	بعد والوں کو	اس کے جیسا ہی ہم کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۹﴾	اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۙ﴿۲۰﴾	فَجَعَلۡنٰهُ
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے پیدا نہیں کیا تم کو ایک حقیر پانی سے	پھر ہم نے رکھا اس (پانی) کو

فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۙ﴿۲۱﴾	اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۙ﴿۲۲﴾	فَقَدَرۡنَا ۟ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ﴿۲۳﴾
ایک مضبوط ٹھکانے میں	ایک طے شدہ اندازے (مدت) تک	پھر ہم قابو یافتہ رہے
تو کیا ہم ہی اچھے قابو پانے والے ہیں		

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۴﴾	اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ۙ﴿۲۵﴾	
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے نہیں بنایا زمین سمیٹنے کے لیے	

اَحۡيَآءً	وَّاَمۡوَاتًا ۙ﴿۲۶﴾	وَّجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ
زندوں کو (اپنی پیٹھ پر)	اور مُردوں کو (اپنے پیٹ میں)	اور ہم نے بنائے اس میں اونچے پہاڑ

وَّاَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ؕ﴿۲۷﴾	وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۸﴾
اور ہم نے پینے کے لیے دیا تم کو شیریں پانی	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

نوٹ: 1

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ ان چیزوں کا نام بیان کرنے کے بجائے ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ مرسلات۔ عاصفات۔ ناشرات۔ فارقات اور ملقیت الذکر۔ کسی حدیث میں بھی یہ تعین نہیں ہے کہ یہ کن چیزوں کی صفات ہیں۔ اس لیے صحابہ اور تابعین کی تفسیریں اس معاملہ میں مختلف ہوگئیں۔ بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے ان کا موصوف انبیاء ورسل کو قرار دیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کے لیے ہیں۔ ان تین میں ہواؤں کی قسم ہے۔ باقی دو صفتیں فرشتوں کے لیے ہیں تو یہ فرشتوں کی قسم ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 2

ان آیات میں بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انہیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، عذر کے طور پر اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اس موقع پر کٹے سے کٹا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اگر معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دور نہیں ہے، وہ تو اللہ کو یاد کرے گا۔ لیکن دوسرے لوگ (یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور لوگ) سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے تو بڑے سے بڑے کافر کو خدا یاد آنے لگتا ہے۔ اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا القاء۔ رہا نُذُرًا (ڈراوے) کے طور پر اس کا القاء تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب آندھی طوفانِ عظیم بن جائے یا بارش اس قدر زور دار ہو کہ سیلاب بلا بن جائے اپنے وقت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹیفیک توجیہات اس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار اختیار کر جاتی ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج6 ص579)

آیت نمبر (29 تا 50)

6940

ل	ھ	ب

(ف) لَهَبًا آگ کا بھڑکنا۔
لَهَبٌ آگ کا شعلہ، بلند غبار۔ زیر مطالعہ آیت۔31۔

ترکیب (آیت۔36) وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ میں نون اعرابی کی موجودگی بتا رہی ہے کہ اس کا فاسبیہ نہیں ہے۔ اگر یہ فاسبیہ ہوتا تو فَيَعْتَذِرُوْا آتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فَا عاطفہ ہے جو لَا يُؤْذَنُ پر عطف ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔ فاسبیہ کے طور پر جو ترجمے کیے گئے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم)

ترجمہ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾	اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ
تم لوگ چلو اس کی طرف	تم لوگ جھٹلایا کرتے تھے جس کو	تم لوگ چلو ایک ایسے سائے کی طرف جو

ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾	لَّا ظَلِيْلٍ	وَّلَا يُغْنِيْ	مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾	اِنَّهَا تَرْمِيْ
تین شاخوں والا ہے	جو نہ گھنی چھاؤں ہے	اور جو فائدہ نہیں پہنچائے گا	آگ کی لپٹ سے	بیشک وہ (آگ) پھینکتی ہے

بِشَرَرٍ	كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾	كَاَنَّهٗ	جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾
ایسی چنگاریاں جو	محل کے مانند ہیں	جیسے کہ وہ (چنگاریاں)	زرد اونٹ ہوں	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾	وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ	فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾
یہ ان کے نہ بول سکنے کا دن ہے	اور نہ اجازت دی جائے گی ان کو	پس وہ معذرت نہ کر سکیں گے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ	جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾	فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ	فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾
یہ فیصلہ کرنے کا دن ہے	ہم نے جمع کیا تم کو اور پہلوں کو	پھر اگر ہے تمہاری کوئی چالبازی	تو تم لوگ چالبازی کرو مجھ سے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾	اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ	فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٤١﴾
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	یقیناً متقی لوگ	سایوں اور چشموں میں ہوں گے

وَّفَوَاكِهَ	مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٤٢﴾	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِيْٓـًٔا بِمَا	كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾
اور پھلوں میں	اس میں سے جو وہ چاہیں گے	تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے بسبب اس کے جو	تم لوگ عمل کیا کرتے تھے

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي	الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٤٤﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٥﴾	كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا
بیشک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں	خوب کاروں کا	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کھالو اور برت لو تھوڑا عرصہ

اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ
بیشک تم لوگ مجرم ہو	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	اور جب کہا جاتا ہے ان سے

ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾
تم لوگ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ	بَعْدَهٗ	يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع
تو (اب) کس بات پر	اس (قرآن) کے بعد	وہ لوگ ایمان لائیں گے

نوٹ: 1

آیت۔35۔36 میں ایک ایسے دن کا ذکر ہے جب کافر لوگ نہ بول سکیں گے نہ کوئی عذر پیش کریں گے۔ یہ ان کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلہ کے وقت ان پر طاری ہوگی۔ اس سے پہلے میدان حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے حتیٰ کہ بعض لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے ان کا مجرم ہونا ثابت کر دیا جائے گا اور جب ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کے خلاف گواہی دے کر ثبوت جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے تو ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیئے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اس طرح قطعی حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ ان کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے اس کو بولنے نہیں دیا یا میں نے اس کی زبان (بولتی) بند کر دی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اس کے لیے زبان کھولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ (تفہیم القرآن)